

ماہیت باری تعالیٰ پر ایک نظر قدیم و جدید نظریات کی روشنی میں

ایک معتدل موقف

اس بحث کے مطابق پہلا موقف بالکل صحیح ہے کہ باری تعالیٰ کی ذات اقدس دیگر تمام مظاہر و موجودات سے مختلف ہے۔ تو اس اعتبار سے اس کے جسمانی وجود کی نفی کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ بغیر جسمانی وجود کے کسی چیز کا تصور میں آنا خود عقلی یا فلسفیانہ نقطہ نظر سے محال ہے۔ اب رہا دوسرا اور تیسرا موقف تو وہ اس لحاظ سے غلط اور مبہم ہے کہ باری تعالیٰ ہمارے اجسام ہی کی طرح ہے۔ اور جہاں تک صفات کے اختلافات کا تعلق ہے تو وہ چار پانچ میں منحصر نہیں ہیں۔ بلکہ اس کی بے شمار صفات ہیں جو مخلوقات کی صفات سے یکسر مختلف اور حیرت انگیز ہیں۔ اس سلسلے میں امام ابو حنیفہ نے تصریح کی ہے کہ باری تعالیٰ کی تمام صفات مخلوقات کی صفات کے خلاف ہیں۔ پناچہ اسکا جاننا ہمارے جاننے کی طرح نہیں ہے، اس کی قدرت ہماری قدرت کی طرح نہیں ہے، اس کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں ہے، اسکا سننا ہمارے سننے کی طرح نہیں ہے اور اس کا تکلم کرنا ہمارے تکلم کرنے کی طرح نہیں ہے۔

وصفاته کلھا بخلاف صفات المخلوقین: يعلم لا کعلمنا، و یقدر لا کقدرتنا،

و یری لا ک رؤیتنا، و یسمع لا کسمعنا، و یتکلم لا ککلامنا۔ (۶۸)

جب اتنا سب صحیح ہے تو پھر اسے صاحب جسم تسلیم کر لینے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے؟ جیسا کہ پچھلے صفحات میں تفصیل گزر چکی کہ بعض سلف صالحین ”تشبیہ“ کی حد تک اس کی جسمانیت کے قائل تھے۔ اس لحاظ سے اس قسم کی بات نہ کوئی بدعت ہے اور نہ ہی کوئی نقص یا عیب کی بات۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ جسم تو ہے مگر وہ دیگر اجسام کی طرح نہیں ہے۔ اور سائنٹفک نقطہ نظر سے اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سائنس نہ تو ”مادہ“ کی حقیقت جانتی ہے اور نہ ”اجسام“ کی۔ اسی طرح اس نے استقرائی اعتبار سے ہماری معلوم شدہ کائنات کے تمام حقائق

کا پتہ بھی نہیں لگایا ہے، ماورائے کائنات کے عجائب تک رسائی حاصل کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔

الغرض ماہیت باری کے سلسلے میں اس اعتراف کے بغیر یہ پیچیدہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہماری حیرتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ لہذا اس سلسلے کے قدیم کلامی مسائل کو ایک دفتر پارینہ تصور کر کے اسے تہہ کر دینا ہی بہتر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ”حدوث عالم“ کے ذریعہ باری تعالیٰ کا وجود ثابت کرنا دین میں ایک بہت بڑا فتنہ بن گیا ہے، کیونکہ اس مردود نظریہ کی بنا پر خداوند عالم کا وجود ثابت ہونا تو درکنار وہ ایک معمر اور چیتان بن کر رہ گیا ہے۔ اور سائنٹفک نقطہ نظر سے اس کا کوئی سریر ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ”کچھ“ نہ کہنا ایک سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے، جو غیر واقعی اور غیر سائنٹفک ہے۔ چنانچہ اگلے صفحات میں قرآن اور حدیث کی بعض تصریحات کی روشنی میں باری تعالیٰ کی ”جسائیت“ پر بحث کی گئی ہے۔

وجود باری کی ایک سائنٹفک دلیل

جدید سائنسی اکتشافات کی بدولت کائنات کے بہت سے اسرار سر بسرے منظر عام پر آ چکے ہیں، جو خلاق عالم کے ”مخلیقی رازوں“ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان نئے حقائق کی روشنی میں خدا کے وجود پر نئے نئے دلائل قائم کرنے کا دروازہ کھل گیا ہے، جن کے مقابلے میں قدیم فلسفیانہ دلائل ایک افسانہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان نئے دلائل کے ذریعہ جدید ذہن و دماغ کو متاثر کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

مثال کے طور پر حدوث عالم ہی کے سلسلے میں وجود باری پر ایک نئی دلیل اس طرح قائم کی جاسکتی ہے کہ ہماری کائنات اربوں کہکشاؤں (گیلکسز) پر مشتمل ایک انتہائی وسیع اور بے کراں کائنات ہے جو ایک دھماکے کے ذریعہ وجود میں آئی ہے، جیسا کہ ”بگ بینک تھیوری“ کے طور پر جدید سائنس کا نظریہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قدر عظیم مادہ کہاں سے آیا اور اس میں دھماکہ کس نے کیا؟ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ رب العالمین نے یہ مادہ اپنی عظیم ترین قدرت سے پیدا کیا (اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ) اور اس میں دھماکہ بھی اسی نے کیا (كَانَتْ رَتْقًا فَفَتَقْنَا هُمَا)۔ یعنی زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے، جن کو ہم نے پھاڑ کر جدا کر دیا۔

اس اعتبار سے یہاں پر نہ صرف خداوند عالم کا وجود ثابت ہوتا ہے بلکہ اس کی ”خلاقت“ اور اس کی عظمت و بزرگی بھی ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قدر وسیع و عریض مادہ جو ناقابل قیاس حد تک انتہائی عظیم ہے، پیدا کرنا اس کی خلاقت کی دلیل ہے۔ اور پھر اس عظیم ترین مادے میں دھماکہ کرنا یا اس کو پھاڑ کر اربوں کہکشاؤں اور ان گنت دلائل و آثار سے ستارے و سیارے پیدا کرنا اس کی عظمت و بزرگی کا واضح ترین ثبوت ہے۔ اس اعتبار سے خالق ارض و سما کی زبردست قوت و عظمت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے، جو متکلمین کے لغو نظریہ کے مطابق ایک معمولی ذرہ (جو ہائیڈروجن یا ہیلیم) سے بھی حقیر و کمتر ہے۔ بھلا ایک ننھا سا ایٹم کیا ہاڑ پھوڑ سکتا ہے؟ فاعتبروایا اولیٰ الأبصار۔

صفات ماری کا سائنٹفک ثبوت

پچھلی دلیل وجود باری کے سلسلے میں تھی۔ اب صفات باری کے ثبوت میں ایک سائنٹفک دلیل ملاحظہ ہو جس سے قدیم و جدید تمام فلاسفہ (منکرین خدا) اور خاص کر معتزلہ کا رد ہوتا ہے جو صفات باری کے منکر تھے۔

ہماری کائنات کا مادہ ابتداء گیس کی شکل میں تھا (جیسا کہ سائنسی تحقیق ہے)۔ اس کی تعبیر قرآن حکیم میں دھوئیں (دخان) کے لفظ سے کی گئی ثُمَّ امْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ مگر اس دخانی مادے سے مختلف خصوصیات رکھنے والے اجرام سماوی ہی نہیں بلکہ خود ”مادے“ ہی کی مختلف قسمیں وجود میں لانا ایک بہت بڑا کرشمہ اور خلاقیت کا مظہر ہے۔ مثلاً مادہ اور ضد مادہ، پلازما، سیاہ مادہ اور سیاہ صحابیہ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ ان اختلافات کی وجہ سمجھنے سے سائنس داں قاصر ہیں۔

اور پھر اس سے بھی بڑا کمال یا جادو گری یہ ہے کہ خدائے ذوالجلال نے اس دخانی یا گیس مادے سے جو دراصل برقی لہروں کا مجموعہ ہے، ہائیڈروجن سے لے کر یورانیئم تک ۹۲ عناصر بنائے، جن میں سے ہر ایک کی طبعیاتی طور پر الگ الگ خصوصیات ہیں۔ ایک سے لے کر ۹۲ تک یہ تمام قدرتی عناصر تسلسل کے ساتھ کس طرح وجود میں آ گئے؟ اس کی گرہ کشائی کوئی بھی سائنس داں نہیں کر سکتا۔ اور پھر ان ”مردہ“ عناصر میں زندگی کس طرح نمودار ہو گئی اور مادی مظاہر میں سماعت، بصارت، قدرت، علم، ارادہ اور تکلم وغیرہ صفات کس طرح ظاہر ہو گئیں؟ اس کی توجیہہ کرنے سے پوری دنیاے سائنس عاجز ہے۔ کیونکہ مفرد عناصر میں یہ خصوصیات ناپید ہیں۔ اور یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان صرف اشیاء کی ظاہری خصوصیات ہی دریافت کر سکتا ہے، ان کے باطنی کوائف کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

لہذا ان غیر مادی صفات کا ظہور بغیر کسی خلاق ہستی کے آپ سے آپ نہیں ہو سکتا۔ اس مظہر قدرت کے ظہور سے یہ ابدی حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ اس کائنات میں کوئی حیرت انگیز ہستی ضرور موجود ہے جو مذکورہ بالا تمام صفات سے متصف ہے۔ ورنہ ایک سمجھ و بصیر ہستی کے وجود کے بغیر سماعت و بصارت کا ظہور نہیں ہو سکتا، ایک قادر مطلق ہستی کے بغیر قدرت یا طاقت نمودار نہیں ہو سکتی، ایک عاقل و باشعور وجود کے بغیر عقل و شعور ظاہر نہیں ہو سکتے، ایک علیم و خبیر پیکر کے بغیر علم وجود میں نہیں آ سکتا۔ وقمن علی ذلک۔

اس اعتبار سے ایک انسان یا ایک باشعور با ارادہ ہستی میں جتنی بھی صفات اور جتنے بھی کمالات نظر آتے ہیں وہ ایک مافوق الطبعی وجود کا پرتو ہیں۔ اگرچہ خالق اور مخلوق میں کوئی مشابہت نہیں ہے، مگر یک گونہ مناسبت ضرور ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح دیکھ اور سن رہا ہے جس طرح انسان دیکھتا اور سنتا ہے، یا یہ کہ اس کا علم اور اس کی قدرت بھی انسان ہی کی طرح ہے۔ غرض وہ لامحدود قوتوں والا اور ہمہ دان و ہمہ بین ہے۔ وہ کھاتا پیتا نہیں ہے، وہ سوتا نہیں، وہ غفلت میں نہیں ہوتا۔ ہمارے رہا

ہے۔ اگر وہ اپنی مخلوق سے نظر ہٹا لے تو پوری کائنات درہم برہم ہو جائے گی۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُمَسِّكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا، وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا

مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ إِنَّهُ كَانَ خَلِيفًا غَفُورًا﴾ (فاطر: ۴۱)

ترجمہ: اللہ یقیناً آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے تو اس کے بعد انہیں کوئی بھی تھام نہیں سکتا۔ یقیناً وہ (اپنے بندوں کے لئے) بڑا دربار اور بخشنے والا ہے۔

انفعال الہی کا سائنٹفک ثبوت

وجود باری اور صفات باری کے اثبات کے بعد اب انفعال باری کا سائنٹفک ثبوت یہ ہے کہ اس نے ایک ”مشتربہ“ مادے سے مختلف خصوصیات والے عناصر و جواہر پیدا کئے جو ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ پھر ان عناصر کی ”ترکیب“ سے مختلف مظاہر و موجودات کو وجود بخشا۔ پھر ان میں سے بعض کو جمادات، بعض کو سموات اور بعض کو نباتات و حیوانات کی شکل دے دی اور ان سب کو رنگ برنگے روپ عطا کئے اور ان کے خصائص میں بوقلمونی پیدا کر دی، جو یقیناً خلأ قیت و ربوبیت کے معجزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس اعتبار سے ہماری اس کائنات میں جتنی بھی اشیاء اور ان کی عجیب و غریب خصوصیات ہیں وہ سب ”انفعال الہی“ کی کرشمہ سازیاں ہیں، جن کی صحیح حقیقت و ماہیت سمجھنے سے جدید سائنس باوجود اپنی ہمہ گیر ترقی کے عاجز و بے بس ہے۔ اور یہ باری تعالیٰ کی ”الوہیت“ کی ایک ناقابل تردید دلیل ہے۔ یعنی انفعال الہی کی تعلیل سے انسان عاجز ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے ہائیڈروجن اپنی طبیعت کے لحاظ سے (مفرد طور پر) ایک جلنے والی گیس ہے اور آکسیجن اپنی اصل طبیعت کی رو سے چیزوں کو جلانے میں مدد دینے والی گیس ہے۔ مگر ان دونوں کے تعامل سے پانی جیسی بجھانے والی چیز کس طرح وجود میں آ گئی؟ اس کی توجیہ کوئی بھی سائنس دان نہیں کر سکتا۔ یہی حال دیگر اشیاء کا بھی ہے۔ اس اعتبار سے یہ پوری کائنات ”جادو کی نگری“ معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ ”الہ“ کا لفظی مفہوم ہے: وہ ہستی جو (اپنے انفعال میں) حیرت انگیز ہو۔ (۱۹)

خلاصہ یہ کہ کلامی نقطہ نظر سے مسئلہ توحید میں جو بحث کی جاتی ہے اس کا دائرہ ذات باری، اس کی صفات اور اس کے انفعال ہیں۔ اور یہ تینوں امور بغیر کسی الجھاوے کے سائنٹفک نقطہ نظر سے دو اور دو چار کی طرح ثابت ہو جاتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اور بھی بہت سے نئے نئے دلائل جدید سے جدید تر سائنسی اکتشافات کی روشنی میں دئے جاسکتے ہیں، جن کے ذریعہ ایک طرف ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف فکری و نظریاتی گمراہیوں کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔ لہذا جدید سائنسی تحقیقات کو زیر بحث لا کر جدید علم کلام کی تدوین کرنا ضروری ہے، جس کے

وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (نحل: ۸۹)

ترجمہ: اور ہم نے آپ پر ایک ایسی کتاب اتار دی ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے۔ اور وہ اہل اسلام کے لئے ہدایت، رحمت اور خوش خبری ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ

بِالْقِسْطِ۔ (حدید: ۲۵)

ترجمہ: ہم نے اپنے رسولوں کو (ہر دور میں) کھلے کھلے دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان بھی اتار دی ہے۔ تاکہ لوگ (جادہ) اعتدال پر قائم رہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ”شخصیت“ پر ایک نظر

اہل کلام نے قدیم فلسفہ کو بنیاد بنا کر باری تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کے بارے میں جو نظریات گھڑے تھے وہ اب بے حقیقت ثابت ہو چکے ہیں، جو نہ صرف قرآن اور حدیث کے خلاف ہیں بلکہ خود سائنسی نقطہ نظر — ی بے اصل معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر قرآن اور حدیث کی روشنی میں بعض حقائق پیش کئے جاتے ہیں، جن کے ملاحظے سے باری تعالیٰ کی شخصیت کھر کر سامنے آتی ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق اللہ تعالیٰ ایک زندہ وجود ہے:

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ، لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ۔ (بقرہ: ۲۵۵)

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی دوسرا الہ نہیں ہے، وہ زندہ اور سب کو تھامنے والا ہے۔ اسے نہ تو اونگھ آ سکتی ہے اور نہ نیند۔

یہ ”آیت الکرسی“ کا ایک فقرہ ہے اور یہ قرآن مجید کی سب سے عظیم ترین آیت کہلاتی ہے، جو توحید باری کے سلسلے میں ہر قسم کی جہالتوں کا خاتمہ کر کے خدائے جبار و قہار کی عظمت و بزرگی ثابت کرتی ہے۔ اس پوری آیت کریمہ کی تفسیر کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ لہذا اس موقع پر صرف چند متعلقہ مسائل کی وضاحت کرنا مقصود ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں: الہ، حی اور قیوم۔ ان کی مختصر تشریح یہ ہے: جیسا کہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ”الہ“ کے لغوی معنی اس ہستی کے ہیں جو حیرت انگیز افعال والی ہو۔ چنانچہ آپ اس پوری کائنات میں جدھر بھی اور جس حیثیت سے بھی نظر ڈالئے ہر طرف آپ کو حیران کن چیزیں اور ان کی حیران کن صفات نظر آئیں گی، جن کی گرہ کشائی انسان اپنی عقل و دانش سے کسی بھی طرح نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ تمام اشیاء اور ان کی انوکھی اور حیرت انگیز خصوصیات اسے درطہ حیرت میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ ایسی زبردست ہستی کو لامحالہ طور پر زندہ اور قیوم ہونا چاہئے، جو تمام موجودات عالم کو تھامنے والی ہو۔ اور ایسی ہستی کو ہمیشہ چوکنا رہنا چاہئے کہ اتنی بڑی کائنات اور ان کے نظاموں میں کسی قسم کا خلل نہ آ سکے۔ تو اس لحاظ سے فرمایا گیا کہ اسے نہ تو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند یعنی وہ نظام عالم کی محافظت

ایک نظر

سے اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی سو گیا یا غافل ہو گیا تو پھر یہ پورا سلسلہ وجود درہم برہم ہو جائے گا۔ لہذا اس سے ثابت ہوا کہ اس کائنات میں ایک حیرت انگیز افعال والی ہستی ضرور موجود ہے جو زندہ ہے اور تمام موجودات عالم کو تھامے ہوئے ہے۔ چنانچہ اس عظیم الشان کائنات کا نفیس اور بے داغ نظام خود ہی ایسی زبردست ہستی کے وجود کی شہادت دے رہا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن اور نظام کائنات میں بہت گہرا ربط و تعلق ہے۔

یہ تھی اوپر مذکور آیت کریمہ کی مختصر تفسیر۔ اب اس موقع پر سائنسی نقطہ نظر سے ایک بحث یہ ہے کہ ”زندہ“ چیز کس کو کہتے ہیں؟ تو زندہ چیز وہ ہے جس میں ”زندگی“ اور اس کے مظاہر (روح اور اس کی کارگزاریاں) موجود ہوں۔ چنانچہ ہماری معلوم شدہ کائنات میں زندگی کا ادنیٰ نمونہ ایک خلوی (سنگل سیل) جراثیم ہے، جس میں مادہ حیات (پروٹوپلازم) ہوتا ہے، جیسے بکٹیریا اور جراثیم۔ یہ ننھے ننھے جاندار زندگی کی ایک اکائی یا یونٹ کہلاتے ہیں، جو ایک خانے یا خول میں بند ہوتے ہیں، جسے اصطلاح میں خلیہ یا سیل (Cell) کہا جاتا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی جاندار چیزیں (حیوانات و نباتات) ہیں سب کے سب انہیں خلیوں کا مجموعہ ہیں، جو ان کے اجسام کی مقدار کے مطابق کم و بیش ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک انسان اس قسم کے کھربوں کھربوں خلیوں کا مجموعہ ہے، جن کو خوردبین کے ذریعہ دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک واحد خلیے کے اندر جو مادہ حیات ہوتا ہے وہ چودہ عناصر کا مجموعہ ہے۔ (۷۰) اور ان مختلف عناصر سے مادہ حیات متشکل ہوا ہے۔ اور بغیر مادہ حیات کے کوئی بھی چیز ”ذی حیات“ نہیں کہلا سکتی۔ اس اعتبار سے ذی حیات شے کے لئے ”جسم“ ہونا لازمی ہے۔ یہ سائنسی دنیا کے مسلمہ حقائق ہیں جن میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ ان کی بنیاد تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔

مگر متکلمین نے اس لحاظ سے غور ہی نہیں کیا اور بغیر کسی ثبوت کے رٹ لگا دی کہ باری تعالیٰ جسم نہیں ہو سکتا۔ جب وہ جسم نہیں ہو سکتا تو پھر وہ زندہ وجود کس طرح ہو سکتا ہے؟ کیا مفرد عناصر و جوہر میں زندگی پائی جاتی ہے؟ کیا اعراض زندہ وجود قرار پاسکتے ہیں؟ اور پھر مزید تماشہ یہ کہ جو چیز نہ جوہر ہو اور نہ عرض وہ زندگی سے متصف کیوں کر ہو سکتی ہے؟ بس قدیم فلسفے کے رد و ابطال کیلئے یہی ایک دلیل کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نہ صرف فلسفیانہ نقطہ نظر سے ایک مذاق ہے بلکہ اس سے قرآن حکیم کا انکار بھی لازم آ جاتا ہے۔ گویا کہ عقل و نقل دونوں اس مردود نظریہ کی خلاف ہیں۔

﴿بَلِّ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعَلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ﴾ (یونس: ۳۹)

ترجمہ: بلکہ انہوں نے اس چیز کی تکذیب کر دی جس کے علم کا وہ احاطہ نہ کر سکے اور اس کی حقیقت ان پر واضح

نہیں ہو سکی ہے۔

دور قدیم میں اگرچہ پروٹوپلازم، خلیہ، جراثیم اور بکٹیریا وغیرہ کی تحقیق نہیں ہو سکی تھی، مگر اس دور کے متکلمین اتنا تو سوچ سکتے تھے کہ مفرد عناصر یا اس سے بھی کمتر اشیاء میں زندگی نہیں پائی جاتی۔ لہذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں

نے انتہاء پسندانہ فلسفیانہ نظریات اخذ کرنے سے پہلے قرآن اور حدیث کی واضح اور صریح دلائلوں کو پوری طرح نظر انداز کر دیا، بلکہ انہیں خاطر میں بھی نہیں لایا۔

واضح رہے کہ اس موقع پر یہ قطعاً مقصود نہیں ہے کہ رب العالمین بھی انہیں چودہ عناصر یا پروٹوپلازم سے مرکب ہے، معاذ اللہ۔ خالق اور مخلوق کی ماہیت میں کسی بھی قسم کی مشابہت نہیں ہے۔ بلکہ اس موقع پر محض یہ دکھانا مقصود ہے کہ جب متکلمین نے ہماری مادی اشیاء پر قیاس کرتے ہوئے باری تعالیٰ کے جسمانی وجود کا انکار کیا ہے تو پھر یہ کیوں نہیں سوچا کہ بغیر جسم کے کوئی شے زندہ یا ذی روح کس طرح ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں میں کھلا ہوا تضاد ہے:

اوپر مذکور آیت میں حتی کے بعد قیوم کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں: اپنی جگہ پر قائم اور تمام مخلوقات کو تھامنے یا ان کی حفاظت کرنے والا۔

القیوم: القائم الحافظ لكل شئ (۷۱)

اس لحاظ سے تمام موجودات عالم کو تھامنے یا ان کی حفاظت کرنے والی ہستی کوئی ”ذرہ“ یا اس سے بھی کمتر چیز نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اسے اس پوری کائنات سے بڑھ کر عظیم ترین جتنے والی ہستی ہونا چاہئے، جیسا کہ اس سلسلے میں ارشاد باری ہے:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ، وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمُوتُ

مُضْطَوِّبَاتٌ بِيَمِينِهِ، سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ (زمر: ۶۷)

ترجمہ: اور انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی، جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے، جب کہ یہ پوری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں تہہ کئے ہوئے ہوں گے۔ (لہذا) وہ ان لوگوں کے شرک سے بری ہے۔

اس آیت کریمہ کی شرح بخاری و مسلم میں اس طرح آئی ہے: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن زمین کو اپنے قبضے میں کر لے گا اور آسمان لپٹا ہوا اس کے داہنے ہاتھ میں ہوگا۔ پھر وہ فرمائے گا کہ میں ہی (حقیقی) بادشاہ ہوں، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟

يقبض الله الأرض يوم القيامة ويطوى السماء بيمينه، ثم يقول أنا الملك أين

ملوك الأرض؟ (۷۲)

زمین اور آسمان کو مع اربوں کہکشاؤں اور ان گنت دلائل و استعاروں کے ایک ہاتھ میں اٹھالینے والی ہستی کس قدر زبردست و عظیم ہوگی؟ (لہذا) وہ ان لوگوں کی توحید پر آمادہ ہوگا جو ہر یا اس سے بھی

نچلے درجے کی چیز قرار دینا ایک بھونڈا ساند اق نہیں تو پھر کیا ہے؟

واضح رہے حدیث نبوی کی اس تصریح کے مطابق ایک اور حقیقت یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ باری تعالیٰ ہماری کائنات اور اس کے مادی مظاہر سے الگ اور جدا ہے۔ اور اس میں رہے ان متکلمین کا جو خلاق عالم کو ”نہ داخل عالم اور نہ خارج عالم“ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اس میں عقیدہ ”وحدت الوجود“ کا بھی رد ہے۔ اور اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ کس چیز کو بنانے والا خود اس چیز کے اندر شامل نہیں ہو سکتا۔ اور پھر خلاق عالم کی عظیم شخصیت ایک ”رتی سی“ کائنات میں کس طرح سما سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ جب وہ پوری کائنات کو ایک ہاتھ میں اٹھا سکتا ہے تو یہ کائنات اس کے لئے ایک ذرا سی چیز ہوگی، جو باری تعالیٰ کی متحمل نہ ہوگی۔ بلکہ اگر وہ ایک گھونسا مار دے تو یہ پوری کائنات چکنا چور ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے یہ عظیم ترین کائنات اس کے لئے ایک چھوٹے سے ”گلوب“ کی ہے، جسے وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ہر ایک مخلوق کی حرکت کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

آیت کریمہ میں چوتھی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ باری تعالیٰ کو اُوں گھ اور نیند نہیں آ سکتی، ورنہ یہ پورا نظام کائنات بگڑ کر رہ جائے گا۔ چنانچہ نیند آنا ذی روح چیز کا خاصہ ہے، ورنہ یہ لفظ بے معنی بن جائے گا۔ اس اعتبار سے وہ ”صاحب نفس“ بھی ہے۔ جیسا کہ اس حقیقت کا انکشاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی اس طرح کرایا گیا ہے:

﴿تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَغْلِبُ عَلَى نَفْسِكَ﴾ (مائدہ: ۱۱۶)

ترجمہ: تو میرے نفس (دل) کے اندر جو ہے اسے جانتا ہے اور جو بات تیرے نفس میں ہے وہ میں نہیں جانتا۔

اس لحاظ سے خالق اور مخلوق میں مشابہت نہ سہی مگر ایک درجے میں مناسبت ضرور ہے۔ چنانچہ اس کی مزید وضاحت ایک حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو موت نہیں آ سکتی، جبکہ تمام جن و انس مرنے والے ہیں۔

لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ الذِّي لَا يَمُوتُ وَالْجَنُّ وَالْإِنْسُ يَمُوتُونَ۔ (۷۳)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن و انس کی طرح اللہ تعالیٰ؟ ایک پیکر حیات ہے، جو صاحب جسم اور صاحب نفس بھی ہے۔ لہذا وہ جیسا بھی ہے اس کی ایک ”شخصیت“ ضرور ہے۔ چنانچہ بعض احادیث میں اللہ تعالیٰ کو ”شی“ اور ”شخص“ بھی کہا گیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی چیز اللہ سے زیادہ غیرت مند نہیں ہے۔

لَا شَيْءَ أَغْيَرُ مِنَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ۔ (۷۴)

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ارشاد رسول ہے: کوئی شخص اللہ سے زیادہ غیرت والا نہیں ہے۔

لَا شَخْصَ أَغْيَرُ مِنَ اللَّهِ۔ (۷۵)

ظاہر ہے کہ غیرت مندی نفس کی ایک کیفیت کا نام ہے، جس کا تصور بغیر ”شخص“ کے نہیں کیا جاسکتا۔ کاش اس قسم کے منطقی دلائل پر فلسفہ زدہ لوگوں نے غور کیا ہوتا! قرآن اور حدیث کی رو سے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ، پیر، چہرہ،

آنکھیں اور انگلیاں وغیرہ تمام اعضاء کا اثبات ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ زبردست قوت والا (قادر اور قدیر) ہر چیز کا علم رکھنے والا (علیم وخبیر) سننے والا (سمیع) دیکھنے والا (بصیر) گفتگو کرنے والا (متکلم) اور ارادہ کرنے والا (مرید) بھی ہے۔ مگر وہ ان صفات میں تمام مخلوقات سے منفرد و ممتاز ہے اور اُس جیسی کوئی دوسری ہستی اس کائنات میں موجود نہیں ہے۔

فلاسفہ اور متکلمین کا رد و ابطال

چنانچہ اس سلسلہ میں ایک حدیث ملاحظہ ہو جس کے ذریعہ باری تعالیٰ کی شخصیت اور اُس کی حقیقت و ماہیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے اور شکوک و شبہات کے تمام بادل چھٹ جاتے ہیں:

حجابه النور أو النار لو كشفه لاحرق سُبُحات وجهه ما انتهي إليه بصره من خلقه: باری تعالیٰ کا حجاب نور یا آگ ہے (یعنی وہ نور کے پردے میں رہتا ہے)۔ اگر وہ اس حجاب کو کھول دے تو اُس کے چہرے کی شعاعیں (یا انوار) ہر اُس مخلوق کو جلا کر خاکستر کر دیں گی جہاں تک اُس کی نگاہ جائے۔ (۷۱)

اس موقع پر سُبحات سے کیا مراد ہے؟ اس کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں جیسے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا جلال ہے، اس سے مراد اس کے چہرے کی روشنی ہے، اس سے مراد اس کے محاسن ہیں وغیرہ۔ لیکن سب سے قریب ترین معنی یہ ہے اگر وہ اپنے اُن انوار کو کھول دے جو اُسے بندوں سے چھپائے ہوئے ہیں تو ہر وہ شخص ہلاک ہو جائے گا جس پر وہ روشنی پڑ جائے، جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو گئے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے تجلی فرمائی۔

وأقرب من هذا كله أن المعنى: لو انكشف من أنوار الله شيء تحجب العباد عنه شيء لأهلك كل من وقع عليه ذلك النور، كما خر موسى صعفاً وتقطع الجبل لدا، لما تجلى الله سبحانه وتعالى۔ (۷۲)

اس عظیم الشان حدیث سے باری تعالیٰ کی حقیقت و ماہیت پوری طرح کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ اور اس میں تمام فلاسفہ و متکلمین کے خود ساختہ نظریات و تخیلات کا رد و ابطال ہے۔ چنانچہ اس حدیث شریف سے کئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں جو یہ ہیں:

- ۱۔ اللہ تعالیٰ نور کے پردے میں رہتا ہے، اس سے اُس کی جہت ثابت ہو گئی۔
- ۲۔ جب جہت ثابت ہو گئی تو اس سے اُس کی جسمانیّت بھی ثابت ہو گئی۔
- ۳۔ باری تعالیٰ کا نہ صرف چہرہ ہے بلکہ اُس کی نگاہ بھی ہے۔
- ۴۔ باری تعالیٰ کے چہرے یا اُس کی نگاہ کے انوار۔ باشعاعوں سے مخلوق کا جل جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ اُس

کی نگاہ سے کوئی چیز خارج ہوتی ہے۔ اس سے بھی نہ صرف باری تعالیٰ کی جسمانیث ثابت ہوتی ہے بلکہ ”کسی چیز“ کا خروج بھی ثابت ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بغیر جسم کے کسی چیز کا خروج محال ہے۔

۵- وہ ”مادہ“ جو مخلوقات کو جلادینے والا ہو وہ کوئی معمولی مادہ نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے وہ کوئی ”سو پر مادہ“ ہو سکتا ہے، جس کا علم انسان کو نہیں ہے۔

۶- اس اعتبار سے خدائے عظیم کا مادہ ہمارے مادے سے یکسر مختلف ہے۔ اور وہ حدوث وہ فنا کی علت سے خالی ہے۔ اور وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

۷- اسی بنا پر اُس کا دیدار دنیا میں کسی بھی مخلوق کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کوئی بھی مخلوق اس دنیا میں اپنے خالق کو دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتی، بلکہ جل کر خاکستر ہو جائیگی جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام باری تعالیٰ کی تجلی کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

﴿فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ ضَعْفًا﴾ (اعراف: ۱۴۳)

ترجمہ: جب اللہ نے پہاڑ پر اپنی تجلی کی تو اُس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

۸- اس سے یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ وہ ساتویں آسمان کے اوپر رہتے ہوئے اپنی کائنات کے جس مقام کو چاہے اُن کی آن میں ”نشانہ“ بنا سکتا ہے۔

۹- اس سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ کوئی بھی مخلوق اُس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی تمام مخلوقات پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

۱۰- جب اُس کی محض ایک نگاہ سے ایک بڑے سے بڑا پہاڑ چکنا چور ہو سکتا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی ہستی نہایت درجہ عظیم اور جلیل القدر ہے اور ایسی عظیم و لا ثانی ہستی ایک ”ذرہ“ یا جو ہر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایک جو ہر ایک پہاڑ کو پھوڑ نہیں سکتا۔

قیامت کے دن دیدار الہی

اس اعتبار سے یہ حدیث حقائق و معارف سے بھرپور ہے، جو ہر قسم کے بے بنیاد نظریات کا قلع قمع کر سکتی ہے۔ اس موقع پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب باری تعالیٰ کو کوئی مخلوق دیکھ نہیں سکتی اور اُس کے دیدار کی تاب نہیں لاسکتی تو پھر وہ آخرت میں کس طرح نظر آئے گا؟ یہی وہ معرکہ لا اراء سوال ہے جو اسلامی فرقوں میں باعث نزاع بن گیا، جس کے نتیجے میں علمی دنگے برپا ہوئے : اور وہ حیرانی و سرگردانی کا باعث بن گیا۔ (جاری ہے)